ڈاکٹر طاہرہ صدیقہ
شعبہ اردو، کنیئرڈ کالج فار ویمن یونیورسٹی، لاہور
ڈاکٹر محمد نوید
گورمانی مرکز زبان وادب لمز، لاہور

انور سجاد کی تخلیقات کے علامتی اظہار میں احتجاجی کیفیت

(افسانہ/ناول/غیر مطبوعہ سٹیج ڈرامہ)

Dr. Enver Sajjad is a physician, artist, kathak dancer, columnist, short story writer, novelist and essayist. He played a constructive and pivotal role in the development of art and performing art through Alhamra Arts Council Lahore. Dr. Enver Sajjad was chairman of Alhamra Arts Council Lahore and during this period he tried and succeeded to approve the model of present building of Alhamra Arts Council Lahore. He also tried his best to improve the standard of Urdu stage drama. He also introduced translated and self-writing modern Urdu dramas. This article reveals an analytical study of three unpublished plays by Dr Enver Sajjad that how he introduced many dimensions for development of modern stage drama with reference to art and thought.

بحیثیت نئے افسانہ نگار انور سجاد نے جدید علامتی اُردو افسانے اور تجریدیت میں فنی لحاظ سے بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔ انھوں نے اپنے کرافٹ اور جدید حسّی تجربے میں ایسے تجربات کیے کہ جو اس سے قبل اُردو افسانے کا حصّہ نہ تھے۔ انور سجاد نئے اُردو افسانے کی وہ نمایاں شخصیت ہیں جن کے اسلوب کی انفرادیت اور موضوعات کی مخصوص سمت ان کے بعد کی افسانہ نگار نسل کو اپنے سحر میں لیے ہوئے ہے۔ پیچیدہ اجتماعی، قومی و سیاسی مسائل کی پیچیدہ علامتی تشکیل ان کی اسلوب کاری کا بنیادی انداز ہے۔ وہ بنیادی طور پر جدیدیت اور ترقی پسندیدیت کا امتزاج ہیں۔ انور سجاد کے افسانے سادہ، بیانیہ اور روایتی اُردو افسانے سے بالکل مختلف ہیں، وہ نہ صرف واضح نظریاتی جہت کی کہانیاں لکھنے کا اہتمام کرتے ہیں بلکہ انھیں کثیر الجہت بنانے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں آئیڈیالوجی کے نمایاں ستون طبقاتی سماج کی تبدیلی، مساوات اور انسانی حقوق کا حصول، ہر نوع کے جبر کا خاتمہ، قومی بقا و سلامتی، ملکی آزادی کا تحفظ اور بین الاقوامی انسان دوستی کی بنیادوں پر استوار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انور سجاد کا احساس وسعتوں سے معمور ہے اور استعاراتی و علامتی نثر جو درحقیقت شاعرانہ نثر ہے، ان کی فکری مجبوری ہے۔ ''سازشی''، ''شہر کے عین وسط میں صحرا تھا''، ''پتھر، لہو اور کتا''، ''سنڈریلا''، ''گنگرین'' ''پرومیتھیس''، ''گائے''، ''کارڈئیک دمہ''، ''کیکر''، ''کونپل''، ''واپسی''، ''دیو جانس''، ''بچھو''، ''یوسف کھوہ''، ''انارکلی''، ''ماں اور بیٹا'' اور ''چھپکلی کی کٹی دم'' ایسے افسانے ہیں جوان کے

نظریےاوراسلوب کی مؤثر ترسیل کر چکے ہیں۔

انورسجادکا پہلاافسانوی مجموعہ''چوراہا''تھااس کےمتعلق ڈاکٹرانیس ناگی کا کہنا ہے:

انورسجادکا پہلاافسانوی مجموعہ''چوراہا''اردوافسانے میں ایک نئےموڑ کا اعلان تھا۔انفرادی گھٹن،سیاسی جبر اورشخصیت کا انتشار''چوراہا'' کےموضوعات تھے۔ان افسانوں میں انورسجاد نے مروجہ رئیلسٹ افسانے سے گریز کر کےافسانے کی مروجہ تین وحدتوں کونظرانداز کیا تھا۔شعور کی روکوافسانے کی بنیادی تکنیک کے طور پراستعمال کر کےعلامت سازی کی تھی۔[۱]

نظریاتی طور پرانورسجادترقی پسندنظریات کے حامل ہیں اوران کی بنیادی دلچسپی فنون لطیفہ کے ہرشعبے سے ہےاسی لیے انھوں نے اُردو افسانے میں مروجہ ترقی پسند روایت سے انحراف کیا اور جدیدیت کے راستے کو اپنایا۔انورسجاد کا افسانوی مجموعہ''استعارے''انھیں بحیثیت علامتی افسانہ نگارمتعارف کراتا ہے۔انورسجاد نے جس نئے اسلوب کوایجادکیا اس میں امیجز ،علامت نگاری اور ماورا واقعیت کے وہ سبھی عناصر شامل ہیں جوایک حدتک شاعری سے مختص رہے ہیں۔انور سجاد چونکہ جدیدنفسیاتی،عمرانی اورسیاسی نظریات کے طالبعلم تھے لہٰذا عالمی اورقومی تناظر میں بدلتے ہوئے سیاسی حالات اوراس کےعوام الناس پراثرات ان کےافسانوں کا خاص حوالہ ہیں۔انورسجادکی بنیادی دلچسپیوں میں صداکاری،اداکاری اورتھیٹراورڈرامے کافن بھی شامل ہےلہٰذاانھوں نے اپنے افسانوں میں ڈرامائی اُتار چڑھاؤ کی تکنیک سے بھی بہت کام لیا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ وہ چونکہ ایک معالج بھی ہیں اس لیےان کےبعض افسانوں میں بعض جسمانی عوارض قومی عوارض کی علامت بنتے دکھائی دیتے ہیں جیسے کہ''گنگرین''اور''کارڈیئک دمہ''وغیرہ قومی زندگی کے سانحوں کو پیش کرتے ہیں۔انورسجاد۱۹۶۰ءکی لسانی تشکیلات کی تحریک کےسرگرم ترین رکن تھےان کےافسانوں کےمطالعہ سےایک نئے پن کا احساس ہوتا ہےمگرساتھ ہی ترسیل وابلاغ والامسئلہ اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔انورسجاد نے اس نئے پن کے لیےاستعارےکو تجریدی صورت میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔

علامتی افسانہ چونکہ ماحول کی جبریت کے دور میں پروان چڑھا لہٰذا یہ جبریت اور گھٹن انورسجاد کے افسانوں کا موضوع بنی اوران کے بیشتر افسانے تجریدی پیرائے میں دورحاضر میں ذات کی شکست وریخت،فردکی تنہائی اورگھٹن کے احساس کوپیش کرتے ہیں۔ان کےافسانوں کے بے نام کرداردنیا کےافراد کےان دکھوں کی نمائندگی کرتے ہیں جوٹوٹے ہوئے انسانی رشتوں کوتلاش کرتے ہوئے اُٹھاتے ہیں۔انورسجاد کےافسانوں کا خاص موضوع جبر کےخلاف احتجاج ہے جو سیاسی و معاشرتی قدامت کے مابین افسانے کی سطح پر اُبھرتا ہے چنانچہ انھوں نے ملکی مایوس کُن سیاسی صورتحال ،جبریت،فسطائیت،جنگ کےخوف،مفلسی وفاقہ کشی،طبقاتی کشمکش،انسانی اخلاقی اقدار کےزوال،ریاکاری اورانسان کی مفادپرستی کوتحریرکرتے ہوئے علامتیت اورتجریدیت کاسہارالےکراُبھارا ہے۔جس میں انسان کا وجوداپنی ماہیت اورزندگی کی معنویت اورمقصدکی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔اس ضمن میں انورسجاد کےافسانے''سازش''،''کونپل''،''دوب ہوا

اور لنجا''، ''پتھر لہو اور کتا''، ''کیکر'' اور ''مکھی کا مونو لاگ'' ان کے فن کی نمائندگی کرتے ہیں اور ان کے مطالعہ کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ انور سجاد شعوری و غیر شعوری طور پر کافکا سے متاثر ہیں۔ انور سجاد کے دو افسانوں ''سنڈریلا'' اور ''پرومیتھیس'' میں اساطیری مزاج کا سہارا لیا گیا ہے۔ اگر چہ افسانہ ''کیکر'' میں بھی سسی فس کا استعارہ بین السطور میں موجود ہے۔ ''سنڈریلا'' عہدِ حاضر کی خواتین کے حوالے سے دُکھ اُٹھانے اور پھول کھلانے کا استعارہ ہے اور سنڈریلا کے روایتی کردار کو اپنے عصر میں درپیش مسائل کے ساتھ ملانے کی کوشش کی گئی ہے جبکہ ''پرومیتھیس'' کی اسطوری جہت یہ ہے کہ اسے انسانیت کو آگ اور آگہی عطا کرنے کی سزا ملی تھی:

> قوی ہیکل جوان دیوتاؤں کی قبیل کا آہنی زنجیروں میں جکڑا چٹان سے نتھی ہے عقاب اس کا جگر نوچ رہا ہے۔[۲]

نور سجاد کے افسانوی مجموعہ ''استعارے'' کے شائع ہونے کے بعد انور سجاد اور انتظار حسین کا موازنہ کیا جانے لگا اس ضمن میں احمد ہمیش کا ایک مضمون ''۷۰ء کے بعد کی نئی اردو کہانی'' بے حد اہمیت کا حامل ہے جس میں وہ انور سجاد کے بارے میں کہتے ہیں:

> یہی انور سجاد کی کرافٹس مین شپ تھی جس کی بنا پر انھیں شمس الرحمٰن فاروقی نے نئے افسانے کا معمارِ اعظم کا خطاب دیا اور باقر مہدی نے انھیں بلراج مینرا کے مقابلے میں سوفسٹیکیٹڈ قرار دیا۔[۳]

انور سجاد نے اپنے مجموعے ''استعارے'' میں انسانی صورتحال میں ظلم و جبریت کو احتجاجی انداز میں دکھایا ہے اور قومی زندگی میں پائی جانے والی جعلی سیاست، جھوٹے مذہبی ٹھیکیداروں کی اجارہ داری اور ایک غیر انسانی ماحول کو مختلف استعارات کے ذریعے بیان کیا اور پوری زندگی کو اس کے فکری، ثقافتی اور جمالیاتی آہنگ کے ساتھ دیکھا۔ انھوں نے ماضی پرستی کے بجائے زندہ شعور کا ساتھ دیا ہے۔ ان کے افسانوں میں چھپکلیاں، گدھ، گوہ، کتے، مداری، فاختہ، چتکبری گائے، بوچڑ خانہ، بانجھ، بادل، دریا، کونپل،، بچھو، غار، صحرا، فصیلیں، نقاب پوش، پستول والا، روشنی، تاریکی، دیواریں، تین ٹانگوں والا تخت تمام بے نام کردار علامتوں کا روپ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ یہ تمام علامتیں ان کے اردگرد پھیلے ہوئے ماحول کی کئی پرتوں کو منعکس کرتی ہیں۔ فینٹسی اور ریلزم کے اتحاد سے تشکیل پانے والی یہ علامات نہ صرف اپنے عہد کی واردات کے اشارے سمیٹے ہوئے ہیں بلکہ ان میں ماضی اور امکان کے بھی بہت سے رابطے پوشیدہ ہیں۔ منتظر مسائل سے بھری دنیا امام مہدی کے ظہور کے معاملات میں اُلجھی ہوئی ہے، مادی مفادات کی صورتحال میں حقیقی انسانی رشتے غائب ہو چکے ہیں، مردوں کے لیے گوشت پوست کی عورتوں کے بجائے ان کی چھاتیوں کے عین درمیان لٹکتے لاکٹوں سے فریفتگی کی حد تک پیار ہے، آمرانہ سیاسی ماحول کے خاتمے کی خاطر احتجاجی صداؤں کا شور بھی بلند ہوتا ہے مگر ماحول جوں کا توں برقرار رہتا ہے، انسانوں کا دم گھٹ رہا ہے اور پرندے سانس کی نوید لے کر پلٹنے سے قاصر ہیں۔ زمین پر بانجھ بادلوں کا سایہ ہے، ایڑیاں مارتے مارتے پاؤں چھل گئے ہیں مگر سفیدی سبز نہیں ہو پاتی اور سبزی سُرخ ہونے کا نام نہیں لیتی، دریا کی

جانب قدم بڑھاتے لوگ زندگی کی کشمکش میں فیصلے اور انتخاب کی اہمیت سے واقف ہیں دریا جو کہ زرخیزی اور زندگی کی علامت ہے۔اذیت خانوں میں تشدّد کا نشانہ بنتے دلیر افراد سماج کی مکمل تبدیلی کے آئیڈیل رکھتے ہیں۔وہ جانتے ہیں کہ ان کے بعد ان کی نئی نسل کو اس کونپل کا تحفظ کرنا ہے جس میں مستقبل کی تبدیل ہونے والی صورتحال کی خوشبو، رنگ اور تاثیر پوشیدہ ہے۔عوامی تحریکیں شکستہ وجودوں کو جینے کا حوصلہ عطا کرتی ہیں، یہ زخمی پرندوں کو دوسرے پرندوں کی آوازوں سے ہم آہنگ کرتی ہیں۔انور سجاد کے افسانوں کے کردار اور واقعات موجود زندگی سے امکانی زندگی کے پُر پیچ راستے طے کرتے ہیں اور پھر اپنے مرکز کی جانب پلٹتے ہیں۔مرکز جو کہ انور سجاد کی توجہ کا مرکز بھی ہے اپنے عہد کی اصلی اور مسائل سے بھرپور زندگی جہاں انسانوں کی قلب ماہیت عمومی ہے اور کافکا کا میٹامارفوسس، سارتر کا فلابیر، کامیو کا پلیگ، انور سجاد کے افسانوں میں متحد الوجود ہونے کے عمل میں ہیں۔وجود کے چولا بدلنے، نامرد ہونے اور سیاسی و سماجی آشوب میں گھرنے کی داستان انور سجاد کے افسانوں میں کُھل کر سامنے آئی ہے۔وہ نئے اُردو افسانے کی اہم ترین شخصیت ہیں جنھوں نے اپنے وجود اور اس کے حوالے سے خارجی دنیا کے انسانی شخصیت کو مسخ کرتے بنیادی مسائل کو اپنے افسانوں کی حدود میں سمیٹا ہے۔ان کے تہہ داریوں سے آشنا تخلیقی انداز کی بدولت نئے اُردو افسانے کو ایسے کوزے مہیا ہوئے کہ جن میں معانی کے ہمہ سمت رواں دواں دریا بند ہو سکتے ہیں۔یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ انور سجاد کے افسانوی مجموعوں ''چوراہا'' اور ''استعارے'' کی افسانوی تخلیقات نے اُردو افسانے کو جس اسالیبی تنوع، تکنیکی پھیلاؤ اور موادی وسعتوں سے ہمکنار کیا ہے کہ اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

انور سجاد نے دیگر ہیئتی تجربات کے ساتھ ساتھ شعور کی رو کی تکنیک کو بھی برتا اور اسے مختلف جہات میں پیش کیا ہے۔اس ضمن میں ان کے افسانہ ''کونپل'' اور ان کے افسانوی مجموعہ ''چوراہا'' کے افسانوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔''کونپل'' افسانہ میں زندگی کے نئے حقائق کی نقاب کشائی ہوتی ہے اور نئی شخصیت دراصل نئی احتجاجی آواز بن کر اُبھرتی ہے۔گولیوں اور شعلے سے آواز ختم کر کے گونگا بنا دینا، سنہرے پتنگے پر دبے قدموں بڑھتی ہوئی چھپکلی کا نشانہ، رسی کا ٹوٹ کر پورٹریٹ پر گرنا، ننھی منی کونپل کا اُبھرنا دراصل یہ تمام علامات انسانی وجود کی شناخت کراتی ہیں اور اس میں واقعہ کے اندر واقعات پنہاں ہوتے ہیں۔جیسے کافکا ''ڈولچی سوار'' میں کامیاب نظر آتے ہیں اسی طرح انور سجاد کے یہاں اس کا متحرک عکس ان کے بیشتر افسانوں میں دیکھنے کو ملتا ہے جیسے کہ ''کونپل'' میں انھوں نے کافکا کی طرح شعور کی رو کی تکنیک اپنائی ہے۔انور سجاد کا افسانہ ''کیکر'' بھی علامتی اور اساطیری رنگوں سے مزین کہانی ہے جس میں فنی پختگی کے ساتھ ساتھ ترسیل و ابلاغ کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔اس افسانے میں انسان کے لاحاصل عمل کے تسلسل کو وجودی فکر کے زیرِ اثر کر کے دکھایا گیا ہے۔ڈاکٹر قاضی عابد انور سجاد کے افسانوں میں اساطیری عمل کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

> اپنی کہانیوں میں انور سجاد نے غیر مانوس تہذیبی منطقوں کی اساطیری روایات کو تجریدی اور غیر مانوس اسلوب میں بیان کر کے جو انفرادیت حاصل کی وہ زیادہ تر لایعنیت کو ہی جنم دے رہی ہے۔[۴]

انور سجاد کے افسانوں سے بے بنیاد مابعد الطبیعات، بیکار حکایاتی اسلوب اور داستانی سبق آموزیاں خارج ہیں۔ تشبیہی اور سطحی تمثیلی اسلوب بھی ان کے دائرہ کار میں شامل نہیں بلکہ استعاراتی گہرائیاں اور تمثیلاتی پیچیدگیاں ان کے فن کی آئینہ بندی میں شریک ہیں۔ غیر یقینی پھیلاؤ اور جمالیاتی ابہام انور سجاد کے وجود کے آشوب اور ان کے ضمیر کی تعقلاتی جہتوں کا منطقی نتیجہ ہیں۔ انور سجاد کے اسلوب اور مواد کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ ان کے افسانے اُردو افسانے کی تاریخ میں ایک نئے اور جاندار دور کی صورت اُبھارتے ہیں۔ سادہ بیانیہ انداز سے واضح گریز، براہ راست اظہار سے کھلم کھلا علیحدگی، روایتی گرامرانہ جملہ سازی سے دانستہ احتراز اور ان کے بجائے پیچیدہ اظہاریاتی انداز کی تزئین، گنجلک علامتی انداز کی آئینہ بندی، نئی شکستہ و ریختہ تلازماتی زبان کا استعمال انور سجاد کو اسلوب کے اعتبار سے روایتی اُردو افسانے سے ممتاز کرنے کے تخلیقی اسباب ہیں۔ سراج منیر سے ایک گفتگو میں انور سجاد نے خود اپنی افسانہ نگاری کے فن کو بیان کرتے ہوئے کہا:

> میری کہانی بھی شاہراہوں پر تیز ڈرائیونگ کی طرح ہے۔ تیز اور ایسی سنسنی سے پُر جو انسانی وجود کے فیبرک کو ہلا دے..... میرے پیشرو ہر شے کو تشبیہ میں دیکھتے تھے..... ان کا سارا سفر مماثلتوں کی تلاش میں ہوتا ہے اور اس سفر میں لفظ بہت ضائع ہوتے ہیں..... میں مماثلتیں تلاش نہیں کرتا بلکہ ملتی جُلتی صورتوں کو ایک ہی میں fuse کر کے دیکھتا ہوں۔ اس طرح ایک بیان کے مختلف امکانات برقرار رہتے ہیں۔ ان کی شدّت ضائع نہیں ہوتی۔ میرے لیے لفظ محترم ہے۔ [۵]

اسی لیے انور سجاد کے افسانوں کی کہانیاں ایک استعارے کی مانند پھیلتی جاتی ہیں کیونکہ وہ حقیقت کو اپنے لسانی پیٹرن میں، اپنے جملوں کی ساخت میں اور اپنے لفظوں کے دروبست میں دریافت کرتے ہیں اور اسے تخلیق کرتے ہیں، اس لیے کہ حقیقت کوئی دی گئی شے نہیں جس کے بیان پر قناعت کی جائے بلکہ موجود کو مختلف زاویوں سے دیکھ کر اسے نئے سرے سے جوڑ جوڑ کر اسے اپنے حوالے سے اسے تخلیق کرتے ہیں، اگرچہ اس میں معروضی صورتحال کا حوالہ موجود ہے مگر اس طرح نہیں جیسے کسی سیاسی منشور یا کسی جذباتی پمفلٹ میں ہوتا ہے۔ انور سجاد کے افسانوں میں خارجی زندگی اور داخلی کیفیاتی ادراک کے متوازن ملاپ نے ان کے اسلوب میں متنوع جہات اُجاگر کی ہیں۔ واقعاتی صداقتوں کو منعکس کرتے الفاظ کی رگوں میں جب ویژن اور داخلی کیفیات کا لہو دوڑتا ہے تو زبان متحرک اور زندہ و تابندہ ہو جاتی ہے۔ حرکی اور زندہ زبان متحرک اور زندہ حقائق کی امین ہوتی ہے۔ انور سجاد کے اسلوب میں الفاظ تخلیقی چمک دمک اور امکانی وسعتوں سے معمور ہیں۔ استعاراتی نامیات، علامتی توانائی اور تاثراتی زرخیزی انور سجاد کے اسلوب کے چمن کو خزاں زدگی سے بچانے میں معاون ہیں۔ تلازماتی امیجری، ایمائی انسلاکات، اشاراتی رابطے اور نشاناتی حوالے ان کے نظریات اور ضمیر کی بھٹی میں پگھل کر کُندن ہوتے ہیں۔ انور سجاد کے افسانوں میں الفاظ کی اکائیاں خانوں میں مقید نہیں ہیں بلکہ باہم دیگر پیوست ہیں۔ زبان کا اس نوع کا برتاؤ افسانہ نگار کے خیالات، جذبات، تاثرات اور نظریات کے متحد الوجود ہونے کی دلیل

ہے۔ان کے ایک افسانے کا اقتباس اس ضمن میں ملاحظہ کیجیے:

سڑک کے کنارے لاریاں، جیپیں، ایک طرف کو ہٹ کر آگ بجھانے والی ٹینکی کی لاری، لوہے کے خود سنگینیں جن کے دیوار کے پار پھولے ہوئے پیٹ، لکڑی کی زبانیں، زخمی نرخرے اوران سب کے سروں پر فضا میں لہراتے پوسٹروں بینروں پر لکھے ہوئے لفظ جن سے منعکس دھوپ کی کرنوں کے صرف دو رنگ قلم کی سیاہی، خون کی سُرخی جذبے کی حدت لیے، صرف ایک آواز، صرف ایک خیال جو صدیوں کے بعد حلق کی کال کوٹھری کی دیواروں کو توڑ کر اب بادِ مخالف کی دوسری مدافعتی دیوار سے ٹکرانے کو تیار ہے کہ الٹی گڑی میخوں والے فل بوٹ، جن کی نوکیں صدیوں سے صحت مند سینوں کا لہو پیتی رہی ہیں۔آج یہ سینے ان میخوں والے فل بوٹوں سے اپنا خون بہا چھینیں گے۔[۶]

نئے دور میں فرد کی منفرد سائیکی، سماجی اور اخلاقی اقدار کی اتھل پتھل، نچلے طبقات کی مجبوریاں، فسطائیت کی متنوع قومی اور بین الاقوامی صورتیں، سیاسی اُتار چڑھاؤ کی وارداتیں اور نظریاتی وابستگیوں کے معاملات انور سجاد کے افسانوں کے خاص اجزا ہیں۔روحوں کے ریشم کو کاٹنے والی تنہائی، اعصاب کے مہین دھاگوں کو کترنے والے اجنبیت کے دانت، جسموں کی زرخیزی کو چاٹ لینے والی جلا وطنی کی زہریلی ہوائیں، منور آنکھوں کو بے بصر کرنے والی لایعنیت اور مہملیت اور اعضا کو تھکا دینے والی میکانکی بے مصرف زیست یہ سب کچھ انور سجاد کے افسانوں کو جدید ترین افسانے کی وسعتوں سے ہمکنار کرنے کے لیے کافی ہے۔محنتوں اور جوہروں کے استحصال سے زرعی اور صنعتی نہنگوں کی شکم سیریاں، انسانوں کی بے بسی، غیر معیاری رہن سہن، کیڑوں مکوڑوں کی سی زندگی انور سجاد کی فنکارانہ صلاحیتوں کی گرفت میں ہے۔ضمیر اور شعور کے اظہار میں حائل رکاوٹیں، غلامانہ شعور کا روز افزوں جال، ہر قسم کے غیر انسانی رویوں کی زہرناکیاں، بین الاقوامی صنعتی لٹیروں کی چالبازیاں انور سجاد کی توجہ سے باہر نہیں ہیں۔وہ اس سارے ماحول کی بیخ کنی کے لیے واضح نقطہ نظر کا سراغ لگاتے ہیں۔ان کے ذہن میں ایسے منظر نامے موجود ہیں جو ایک نئی طرز کے انسانی نظام کی امانتیں لیے ہوئے ہیں۔انور سجاد انہی معنوں میں ایک کمیٹڈ افسانہ نگار ہیں اوران کی وابستگی ایک صحت مند زندگی اور سماج کی آزادانہ نشونما کا جوہر رکھنے والے نظام سے ہے۔شہزاد منظر انور سجاد کو رجحان ساز جدید افسانہ نگار قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

انور سجاد اردو افسانے کی دنیا میں پرچم بغاوت لہراتے ہوئے اس وقت وارد ہوئے جب اُردو افسانے میں سوائے محبت اور جنس کے اور کچھ نہیں رہا تھا۔۔۔ایسے دور میں افسانے میں انور سجاد کی جانب سے تجریدی اور استعاراتی طرزِ بیان اختیار کرنا اور قارئین اور ناقدین سے اپنی علیحدہ حیثیت منوا لینا آسان نہیں تھا۔۔۔جدید افسانے میں انور سجاد کو اس لیے بھی اہمیت حاصل ہے کہ انھوں نے اردو میں فارمولے کی بنیاد پر قائم کرافٹ اسٹوری کی روایت کو توڑا اور مصوری، شاعری اور افسانہ نگاری کی روایت کے امتزاج سے

افسانے کو نئی شکل دینے کی کوشش کی اور اس طرح انھوں نے اردو افسانے میں روایت شکن کا کردار ادا کیا۔ ۷

۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کے درمیان جب نئے افسانے کے خدوخال واضح ہونا شروع ہو گئے تھے اور انتظار حسین کے افسانوی مجموعہ ''آخری آدمی'' اور انور سجاد کے ''استعارے'' کے ساتھ ہی زندگی کو جدید تناظر اور جدید رویوں کے حوالے سے دیکھا جانے لگا تھا۔ ممتاز شیریں نے مغربی افسانے کے اثرات سے ہمارے یہاں تکنیک کا جائزہ نئی فنی بنیادوں پر لیا تو ایسے میں اظہاریت، شعور کی رو، تجریدیت اور علامت نگاری کے وسیلوں سے نیا افسانہ تخلیق کیا جانے لگا۔ ان حالات میں جن افسانہ نگاروں نے کہانی کو افسانے کے سانچے میں ایک نئی کروٹ کے طور پر دریافت کیا، ان میں اہم نام خالدہ حسین، مسعود اشعر، اسد محمد خان اور مظہر الاسلام کا ہے۔

انور سجاد بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ''استعارے'' ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔ انھوں نے قدیم روایات سے منہ موڑ کر جدید عہد میں نئے رجحانات کو متعارف کرایا۔ ان کی تخلیقات میں ترقی پسند سوچ غالب ہے۔ پاکستان کی تشکیل سے لے کر مارشل لا کے نفاذ تک حالات و واقعات کے جبر نے اظہار رائے پر جو پابندیاں لگائیں، ان کی بنا پر بات کہنا دشوار ہو گیا۔ ان حالات میں علامت کو اظہار کا وسیلہ بنا کر اپنے جذبات کو بے حد عمدگی سے پیش کیا۔ انور سجاد نے اپنی تخلیقات میں دیومالا، اساطیر اور داستانوی عناصر سے بھی کام لیا ہے۔ افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ انھوں نے ناول بھی تخلیق کیے۔ ان کا اولین ناول ''رگ سنگ'' ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ انور سجاد جدید ناول نگار ہیں اور فنی اعتبار سے ان کے ناول ان کے افسانوں سے زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ ان کا تعلق ۱۹۶۰ء کی ادبی تحریک سے تھا اور اس کے اثرات ان کی تخلیقات میں بے حد نمایاں ہیں۔ اس تحریک کا لب لباب کلاسیکی اسلوب نگارش کے خلاف تھا لہٰذا انور سجاد نے اپنے ناولوں کے ذریعے اُردو ناول کی روایت سے انحراف کیا۔ ان کے ناولوں میں حقیقت نگاری کا عنصر کافی نمایاں ہے اور واقعات کو زیب داستان کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اپنے اس منفرد اسلوب کی بنا پر انور سجاد اُردو ناول نگاری میں ممتاز مقام پر فائز ہیں۔

انور سجاد کافکا اور الان راب گریے سے بے حد متاثر ہیں۔ کافکا کی وجہ شہرت تخیل، حقیقت اور عدم حقیقت کا امتزاج ہے۔ اس کے کردار بظاہر ایک مانوس دنیا سے متعلق ہوتے ہیں مگر ان کے عوامل انھیں غیر مانوس دنیا کی جانب لے جاتے ہیں۔ لیکن کافکا کے ناولوں میں منطقی ربط و تسلسل کا فقدان ہے۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی کا یہ ادیب اپنے تجربات کی بنا پر مشہور تھا۔ کافکا کی وجہ شہرت تخیل، حقیقت اور عدم حقیقت کا امتزاج ہے۔ اس کے کردار بظاہر ایک مانوس دنیا سے متعلق ہوتے ہیں مگر ان کے عوامل انھیں غیر مانوس دنیا کی جانب لے جاتے ہیں۔ لیکن کافکا کے ناولوں میں منطقی ربط و تسلسل کا فقدان ہے۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی کا یہ ادیب اپنے تجربات کی بنا پر مشہور تھا۔ اسی طرح الان راب گریے بھی کہانی کے عنصر کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ وہ حقائق اور واقعات کو ایک مظہر کے طور پر پیش کرتا ہے اور ناولوں کو سنالیو کی تنیک میں لکھتا ہے۔ انور سجاد

نے بھی ان تکنیکوں کو بھرپور طریق سے استعمال کیا جس کے نتیجے میں عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان کے ناولوں میں ابہام ہے۔

انور سجاد کا اولین ناول ''رگ سنگ'' اپنے موضوع کے اعتبار سے بالکل نیا ہے۔ اگر چہ یہ ناولٹ انور سجاد نے زمانہ طالبعلمی میں لکھا مگر پھر بھی یہ عصر حاضر کا ناولٹ معلوم ہوتا ہے۔ اس ناول کا موضوع آج کے دور کا انسان ہے جو اپنے خالق کی مانند اکیلا ہے۔ یہ اس انسان کی کہانی ہے جس کی ذات اس کے معاشرے میں گونجنے والے بھاری بھرکم قہقہوں میں گم ہو چکی ہے۔ یہ اس معاشرے کی کہانی ہے جو استحصال کرتا ہے، اس معاشرے میں بے رونق چہرے مصنوعی روشنی سے چمکتے نظر آتے ہیں اور خود فراموشی کے جال میں مقیّد ہیں۔ آج کا انسان بھی اس ناول کے مرکزی کردار سیفی کی مانند تنہا ہے۔ انور سجاد نے فرد کی تنہائی اور کرب کو محسوس کیا اور اسے ایسے رنگ میں پیش کیا کہا انور سجاد بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ''استعارے'' ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔ انھوں نے قدیم روایات سے منہ موڑ کر جدید عہد میں نئے رجحانات کو متعارف کرایا۔ ان کی تخلیقات میں ترقی پسند سوچ غالب ہے۔ پاکستان کی تشکیل سے لے کر مارشل لا کے نفاذ تک حالات وواقعات کے جبر نے اظہار رائے پر جو پابندیاں لگائیں، ان کی بنا پر بات کہنا دشوار ہو گیا۔ ان حالات میں علامت کو اظہار کا وسیلہ بنا کر اپنے جذبات کو بے حد عمدگی سے پیش کیا۔ انور سجاد نے اپنی تخلیقات میں دیو مالا، اساطیر اور داستانوی عناصر سے بھی کام لیا ہے۔ افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ انھوں نے ناول بھی تخلیق کیے۔ ان کا اولین ناول ''رگ سنگ'' ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ انور سجاد جدید ناول نگار ہیں اور فنی اعتبار سے ان کے ناول ان کے افسانوں سے زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ ان کا تعلق ۱۹۶۰ء کی ادبی تحریک سے تھا اور اس کے اثرات ان کی تخلیقات میں بے حد نمایاں ہیں۔ اس تحریک کا لب لباب کلاسیکی اسلوب نگارش کے خلاف تھا لہٰذا انور سجاد نے اپنے ناولوں کے ذریعے اُردو ناول کی روایت سے انحراف کیا۔ ان کے ناولوں میں حقیقت نگاری کا عنصر کافی نمایاں ہے اور واقعات کو زیب داستان کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اپنے اس منفرد اسلوب کی بنا پر انور سجاد اُردو ناول نگاری میں ممتاز مقام پر فائز ہیں۔

انور سجاد کافکا اور الان راب گر یے سے بے حد متاثر ہیں۔ کافکا کی وجہ شہرت تخیل، حقیقت اور عدم حقیقت کا امتزاج ہے۔ اس کے کردار بظاہر ایک مانوس دنیا سے متعلق ہوتے ہیں مگر ان کے عوامل انھیں غیر مانوس دنیا کی جانب لے جاتے ہیں۔ لیکن کافکا کے ناولوں میں منطقی ربط وتسلسل کا فقدان ہے۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی کا یہ ادیب اپنے تجربات کی بنا پر مشہور تھا۔ اسی طرح الان راب گر یے بھی کہانی کے عنصر کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ وہ حقائق اور واقعات کو ایک مظہر کے طور پر پیش کرتا ہے اور ناولوں کو سنالیو کی تنیک میں لکھتا ہے۔ انور سجاد نے بھی ان تکنیکوں کو بھرپور طریق سے استعمال کیا جس کے نتیجے میں عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان کے ناولوں میں ابہام ہے۔

انور سجاد کا اولین ناول ''رگ سنگ'' اپنے موضوع کے اعتبار سے بالکل نیا ہے۔ اگر چہ یہ ناولٹ انور سجاد نے زمانہ طالبعلمی میں لکھا مگر پھر بھی یہ عصر حاضر کا ناولٹ معلوم ہوتا ہے۔ اس ناول کا موضوع آج کے دور کا انسان ہے جو اپنے خالق

کی مانند اکیلا ہے۔ یہ اس انسان کی کہانی ہے جس کی ذات اس کے معاشرے میں گونجنے والے بھاری بھرکم قہقہوں میں گم ہوچکی ہے۔ یہ اس معاشرے کی کہانی ہے جو استحصال کرتا ہے، اس معاشرے میں بے رونق چہرے مصنوعی روشنی سے چمکتے نظر آتے ہیں اور خود فراموشی کے جال میں مقیّد ہیں۔ آج کا انسان بھی اس ناول کے مرکزی کردار سیفی کی مانند تنہا ہے۔ انور سجاد نے فرد کی تنہائی اور کرب کو محسوس کیا اور اسے ایسے رنگ میں پیش کیا جس میں رومانویت کے وہ تمام لوازمات موجود ہیں جو پچاس کی دہائی کے رومانوی ناول نگاروں میں ملتے ہیں۔ انور سجاد نے زندگی کی یکسانیت، افراد کی بے مقصدیت اور ان کی بے راہروی کو بہت قریب سے دیکھا ہے جس کی مثالیں ''رگ سنگ'' میں دیکھی جا سکتی ہیں:

> وہ سارا دن یا تو گھر میں کبوتروں اور چوزوں کے ساتھ کھیلتا رہتا ہے۔ یا پھر اپنی امی کی گود میں لیٹا رہتا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ''کبوتر باز کہیں کا''۔ ۸

انور سجاد کے ناول ''رگ سنگ'' کا مقام اُردو ناول کی تاریخ میں نئے رجحان کو متعارف کرانے کی حیثیت سے واضح ہے۔ انور سجاد کا دوسرا ناول ''خوشیوں کا باغ'' ۱۹۸۱ء میں منظر عام پر آیا جو اپنے تجربے اور ہئیت کے لحاظ سے ذرا سی قابل قبول تبدیلی کا اعلان کرتا ہے۔ اس ناول کے ذریعے انور سجاد نے اُردو ناول کی مروجہ ہئیت کو توڑنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے ناول کے مختلف حصوں میں جذباتی فضا کے نفسی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے اسلوب میں بھی تبدیلیاں کی ہیں۔ کہیں اس میں گھن گرج ہے اور کہیں سکوت اور سکون کا احساس ہوتا ہے۔ ''خوشیوں کا باغ'' تیسری دنیا کی جدوجہد کی علامتی تعبیر ہے۔ یہ ایک فرد، چند افراد یا ملک کی کسی مخصوص صورتحال کا ناول نہیں بلکہ تاریخ کے عمرانی عوامل، محرکات اور انسانوں کے انبوہ در انبوہ مدرکات اور ان کی نفسیات کی کہانی ہے۔ ڈاکٹر انور سجاد ایک غیر مطمئن ادیب ہیں جو زندگی اور معاشرے کو جیسا دیکھنے کے آرزومند ہیں، وہ ویسا نہیں ہے۔ لہٰذا ان کا سارا فکشن افسانے، ناول اور ڈرامے سبھی میں ان کے اظہار میں احتجاج کی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ادب میں جو کمٹمنٹ ظاہر کی ہے، اس کے اندر اپنے ملک، اپنے معاشرے اور تہذیب میں جو خامیاں ہیں، انھیں دور کرنے کے لیے انھوں نے ادب کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا ہے۔ اسی لیے ''خوشیوں کا باغ'' کے اظہار کو ان کی فکر اور تجربے سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ انور سجاد کے ناولوں ''خوشیوں کا باغ'' اور ''جنم رُوپ'' میں ان کے اندر کا جوشیلا اور احتجاج کرنے والا سچا پاکستانی نظر آتا ہے جو کوئی بھی بات کرتا ہے تو اس کے اندر بھرپور طنز اور بھرپور کاٹ ہوتی ہے۔ یہ ان طبقات کے لیے ہوتی ہے جنھوں نے اس ملک کو نقصان پہنچایا یا عوام دشمنی کا بیج بویا۔ یوں ''خوشیوں کا باغ'' کا اسلوب عام بیانیہ اسالیب سے مختلف ہے کیونکہ یہ روایتی اسلوب میں نہیں لکھا گیا۔ اس ناول میں انور سجاد کے تصورات، ان کی فکری لہریں، ان کے تجربے کے تمام پہلو موجود ہیں اور ایک مخصوص تکنیک میں ڈھل کر سامنے آئے ہیں۔ جس کے اندر کہیں خود کلامی ہے تو کہیں خطابیہ انداز، کہیں ایک کہانی کار، ایک مصور اور ایک اداکار سامنے آجاتا ہے اور کہیں ایک عام آدمی جو کھڑا اپنا احتجاج ریکارڈ کروا رہا ہے۔ اتنی بے شمار حیثیتوں سے مصنف اس ناول میں موجود نظر آتے ہیں تو ظاہر ہے کہ اس ناول کا اسلوب بھی سادہ یا ایک پرت پر مشتمل

نہیں ہوگا بلکہ اس کے اسلوب کی کئی جہتیں ہوں گی۔ناول ''خوشیوں کا باغ'' میں بے شمار اقتباسات ہیں جو ہمارے سامنے اداکار انور سجاد کو پیش کرتے ہیں اور یوں لگتا ہے کہ جیسے واقعی کسی اسٹیج پر انور سجاد کھڑے ہوکر مکالمے ادا کر رہے ہیں۔ان کے مکالموں میں اتنی جان ہے کہ سامعین اس منظر میں کھو سے جاتے ہیں۔ذیل کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

تو کہاں ہے؟

ہم تیراانتظار کرتے ہیں۔

امام مہدیؑ ہمارے جسموں کا پانی ختم ہوتا ہے۔

مسیح موعودؑ ہمارے معدوں میں خلا ابھرتے ہیں۔

گوڈو۔

ہمیں ہماری کشتی تک لے جا، بادبان کھول، رسیاں تھام۔تو آتا کیوں نہیں؟ دن ڈوبتا کیوں نہیں؟ سورج نکلتا کیوں نہیں [9]

انور سجاد مصور، اداکار، ڈرامہ نگار، افسانہ نگار، ڈائریکٹر اور سیاسی نظریہ ساز کی حیثیت رکھتے ہیں لہذا ان کی ان تمام حیثیتوں کا اثر ان کے ناول ''خوشیوں کا باغ'' کے اسلوب پر واضح نظر آتا ہے اور ان کی شخصیت کے ان مختلف رنگوں کو اس ناول کے اسلوب سے علیحدہ کر کے دیکھا جانا ممکن نہیں۔''خوشیوں کا باغ'' میں واضح کردار نہیں ہیں اور زمان ومکان کو بھی توڑا گیا ہے۔دیکھا جائے تو انتظار حسین، انور سجاد اور رشید امجد وغیرہ زبان بہت اچھی استعمال کرتے ہیں۔ان کا اسلوب نثری نظم کے انداز کا ہے۔چنانچہ زبان سمجھ میں آئے یا نہ آئے لیکن زبان کے استعمال سے یہ ذائقہ ضرور پیدا کرتے ہیں۔اس ضمن میں انور سجاد کی درج ذیل بات دیکھیں تو ایک خاکہ سا ذہن میں ابھرتا ہے کہ انور سجاد قارئین سے کیا توقع رکھتے ہیں اور اپنی اس تخلیق کو کس رنگ میں دیکھتے ہیں:

میں فنی تجربوں کو بہت مستحسن تصور کرتا ہوں۔اس سے نئے امکانات کو پالینے میں مدد ملتی ہے۔بعض حالات میں تجربہ برائے تجربہ کا بھی قائل ہوں،۔۔۔لیکن فنی تجربات میرے لیے ذاتی مشق کی حیثیت رکھتے ہیں۔جب تک میں ان تجربات سے قائل ہوکر کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر لیتا تب تک کہانی مجھ تک محدود رہتی ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ ہم میں سے جو اپنے فنی تجربے کو یوں نہیں پرکھتا خود بھی کنفیوژن کا شکار ہوتا ہے۔[10]

انور سجاد نے اظہار میں مختصر سے مختصر طریقہ اختیار کیا۔انھوں نے ناول ''خوشیوں کا باغ'' جس زمانہ میں تخلیق کیا ،قاری کے ذہن میں یہ تصور تھا کہ ناول بے حد ضخیم صنف ادب ہے۔انور سجاد نے افسانہ نگاری کی تکنیک سے مدد لے کر اس میں دیگر خوبیاں شامل کر کے ایک خاص حوالے سے یہ ناول خلق کیا۔انھوں نے اپنے افسانوں سے ہٹ کر اس ناول میں حقیقت نگاری، مقصدیت، شاعرانہ نثر، مونتاژ، تلازمہ خیال اور تبصروں کو باہم گھلا ملا کر پیش کیا ہے۔یہ ناول ان آفاقی

سچائیوں کا اظہار ہے جو موجودہ عہد میں معاشرے سے مفقود ہو چکی ہیں۔ یہ ناول پاکستان کی جدید شہری زندگی کے سماجی مسائل کا احاطہ کرتا ہے۔ ''خوشیوں کا باغ'' میں قصے کی بنیاد ہالینڈ کے مشہور مصور بوش کے تین تصویری پینلز پر رکھی گئی ہے۔ انھوں نے انہی پینلز کے آئینے میں اپنے عہد کو منعکس ہوتے دکھایا ہے۔ ان تصاویر میں استعمال ہونے والی علامتیں اور استعارے ایک عدم توازن سماج کے عکاس ہیں، جس میں ظلم وستم، مذہب کا استعمال معاشرتی ناانصافی اور جمہوری روایات کے قتل کے لیے کیا جاتا ہے۔ انور سجاد نے بطور بیانیہ اس ناول کا دائرہ پاکستانی معاشرے تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے تیسری دنیا تک پھیلا دیا ہے، جس میں نہ انصاف ہے نہ امن وسکون بلکہ یہاں صرف بے بسی اور گھٹن کا راج ہے۔ بقول بلراج کومل:

> انور سجاد کا ''خوشیوں کا باغ'' نام سے تو خوشیوں کا باغ ہے لیکن ان تمام خوشیوں سے محروم ہے جو کردار اور واقعہ کی آمیزشوں سے جنم لیتی ہے۔[۱۱]

ناول کا مرکزی کردار ''میں'' ایک چیف اکاؤنٹنٹ ہے جو اپنی ذات اور اپنے اردگرد کے ماحول ونظام سے نالاں ہے۔ وہ زندگی میں مارکسی انقلاب دیکھنے کا آرزومند ہے۔ وہ تیسری دنیا کے ایک ایسے ملک کا باشندہ ہے جہاں مذہب کے نام پر بربریت اور ریاستی تشدد کا بازار گرم ہے۔ کسی کو معلوم نہیں اگلے لمحے کیا واقعہ پیش آجائے، ہر وقت جنگ کے سائے اس کے سر منڈلاتے رہتے ہیں اور مجموعی تناظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس پورے معاشرے کی تقدیر کی ڈور بڑی طاقتوں کے ہاتھوں میں ہے جو چھوٹے چھوٹے ملکوں کو معاشرتی اور اقتصادی طور سے کچل دینے کے عزائم کے ساتھ کام کر رہی ہیں۔ یعنی یہ تیسری دنیا اپنے کرم خوردہ اور استحصالی نظام کو تبدیل کرنے پر قادر نہیں۔ یوں اس کے ارادے اور اختیار کو مفلوج کر کے رکھ دیا گیا ہے اور اس سارے منظر نامے میں وہ جبر وتشدد کے نظام سے بری طرح منتشر خاموش تماشائی بن چکا ہے۔ اس کی احتجاج کی طاقت ختم ہو چکی ہے۔ ''میں'' سماجی ناانصافی کے شکار معاشرے میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ داخلی شکست وریخت، ذات کا بنجر پن، خارجی جبریت، انسانی واخلاقی اقدار کی پامالی کو انور سجاد نے اپنے مخصوص طرز احساس کے ذریعے تخلیق کیا ہے۔ ''خوشیوں کا باغ'' اسی طرز کی ناانصافیوں اور ظلم وستم سے ترتیب پاتا ہے۔ درج ذیل اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> مغرب کے ماہر فوجی چالباز سراغ رسانی کے خفیہ ادارے اور ان کے فلسفی۔۔۔ان کی بھوک کبھی نہ مٹنے والی، ان کی گرسنگی کبھی نہ بدلنے والی، سدا قائم رہتی ہے۔ ان کا طریقہ واردات بدلتا رہتا ہے۔ کبھی پیار، کبھی غصہ، کبھی دھونس کبھی جنگ۔ اس ہاتھ سے اگر آپ کو دیتے ہیں تو دوسرے ہاتھ سے اصل زر بمع سود در سود وصول کر لیتے ہیں، اور آپ کو اپنے وسائل پر قدرت حاصل کرانے والی جدید ٹیکنالوجی کی طرف دیکھنے نہیں دیتے کہ اگر جدید ٹیکنالوجی سے آپ نے اپنا مقصد پالیا تو آپ ان کے دست نگر نہیں رہیں گے۔[۱۲]

یہ مشینی کلچر کے ساتھ فروغ پانے والی تہذیبی اقدار کے ملبے سے رینگ کر نکلتی ہوئی ایک نئی جمالیاتی قدر کے ظہور کا

اعلانیہ ہے۔منتشر، پراگندہ، بدہئیت اوراس کا مجموعی ماحول تشدد، اشتعال اور دہشت سے لبریز ہے۔اس ناول کے مطالعہ کے لیے قاری سے بھی کچھ تقاضے مقصود ہیں۔اسی لیے ہر تحریر کا قاری مختلف ہوتا ہے۔ناول ''خوشیوں کا باغ'' کی تفہیم ریاضت کا مطالبہ کرتی ہے۔بقول ڈاکٹر انیس ناگی:

> وہ استعاروں میں سوچتا ہے اور استعاروں کے ذریعے اظہار کرتا ہے۔جس کی وجہ سے ان کہانیوں میں تجرید کا عنصر کافی نمایاں ہے۔اسی لیے عام قاری کے لیے بعض اوقات افہام میں دقت پیش آتی ہے۔[۱۳]

انور سجاد صحیح معنوں میں تجربہ پسند جدید ناول نگار ہیں۔انھوں نے ''خوشیوں کا باغ'' اور ''جنم رُوپ'' جیسے جدید ناول تخلیق کیے۔ان کے ناولوں پر مغربی فلسفیوں اور ناول نگاروں کا اثر بے حد واضح ہے۔وہ اپنے ناولوں کو اس قدر تجریدی بنا دیتے ہیں کہ ان کے ناولوں کا قاری ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔جیسے یہ مختصر سا اقتباس دیکھیے:

> تھیا، تھیا، تھیا مجھے خود پر اختیار نہیں رہتا، میں بے قابو ہو کر ناچنے لگتا ہوں، میرے جسم کا ریشہ ریشہ تڑپتا ہے، ناچو درون رامی رقصم، میں ناچتا ہوں، تھال میں کٹا ہوا سر۔[۱۴]

انور سجاد نے ''خوشیوں کا باغ'' کے تیسرے پینل کو تیسری دنیا کے ممالک کی سیاسی وسماجی صورتحال کا استعارہ بنایا ہے۔بوش کی تصاویر کا تیسرا پینل موسیقی کا جہنم ایک طرح سے فکری سطح پر انور سجاد کے لیے تحریک کا باعث بنا ہے اور یہی تحریک انھیں گردوپیش کے حالات کی ایک نئی معنویت تک لے جانے کا باعث ہوئی ہے۔بلاشبہ ہماری ادبی روایت میں یہ کہانی کار کا مروجہ سانچوں سے بالکل الگ اور منفرد رجحان ہے۔اس ضمن میں ڈاکٹر انیس ناگی رقمطراز ہیں:

> انور سجاد کے دوسرے ناول خوشیوں کا باغ کو تجرباتی ناول کہا جاتا ہے کہ اس میں ناول کے روایتی فارمیٹ سے انحراف کر کے رومانوی اور شاعرانہ زبان کے ذریعے معنی کی تشکیل کی گئی ہے۔یہ ایک بے نام اکاونٹنٹ کی داستان ہے جو معاشرتی اور انفرادی ناخوشی کا شکار ہے۔وہ اپنی بیوی سے رنجیدہ ہے اسے اپنی ماں کے مرنے کا کوئی دکھ نہیں، وہ کلبوں میں وہسکی پیتے ہوئے انقلاب کا خواب دیکھتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ اس ناول میں تیسری دنیا کے اضطراب اور فسطائیت کو علامتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔اس ناول کا انجام غیر متوقع طور پر صوفیانہ رقص پر ہوتا ہے۔انور سجاد کے نزدیک یہ تیسری دنیا کا حل ہے۔فنی اعتبار سے اس ناول کو ٹکڑوں میں لکھا گیا ہے۔اس لیے غیر مربوط ہے۔۔۔انور سجاد نے ناول کے تھیم پر توجہ دینے کے بجائے شاعرانہ اور جذباتی نثر لکھنے کو ترجیح دی ہے۔[۱۵]

انور سجاد نے اپنی تکنیک کے اعتبار سے ناول کی کہانی کو ٹکڑوں میں منقسم کیا ہے یعنی مونتاژ کی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ناول میں چیف اکاونٹنٹ کی ذاتی زندگی کی کہانی کے ٹکڑے علیحدہ اور معاشرے میں پائی جانے والی خرابیوں، جبر و استحصال، بے انصافی، فسق و فجور، ظالمانہ قوانین، انسانیت، محبت و باہمی احترام کے خاتمے کے بعد نسلی، علاقائی، سیاسی و مذہبی گھٹن و تنگ نظری وغیرہ کے حصے علیحدہ موجود ہیں۔لیکن جا بجا مختلف افکار و خیالات کو گڈ مڈ بھی کر دیا گیا ہے۔ایک

بات کا تاثر ابھی جمنے نہیں پاتا کہ دوسری بات اس پر سپر امپوز کر دی جاتی ہے۔ڈاکٹر انور سدید اس حوالے سے کہتے ہیں:

> انور سجاد کا ناول ''خوشیوں کا باغ'' سیاسی آگہی کا مرقع ہے اور ہر چند اس کا اسلوب علامتی ہے، تاہم انور سجاد جب حالیہ دور کے سامنے کے واقعات کی طرف رخ کرتے ہیں تو علامت اپنا تخلیقی حسن قائم نہیں رکھ سکتی اور صورت واقعہ علامت کی تہہ کے ساتھ چپکی ہوئی نظر آتی ہے۔[16]

''خوشیوں کا باغ'' کسی کہانی کو ساتھ لے کر نہیں چلتا بلکہ کسی حد تک کہانی کے تسلسل کی تردید بھی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔انور سجاد نے اس ناول میں شعور کی رو کی تکنیک کو بھی استعمال کیا ہے۔شمس الرحمن فاروقی ''خوشیوں کا باغ'' کے اسلوب واظہار کے متعلق اپنے مضمون ''انور سجاد۔انہدام یا تعمیر نو'' میں لکھتے ہیں:

> ان کے ناول ''خوشیوں کا باغ'' میں بیانیہ اور مکالمے کے روایتی انداز سے ہٹنے لیکن خود اپنے گزشتہ انداز سے انحراف کی ایک اور کوشش بھی ملتی ہے۔تفصیلات کا وہ بیان جس میں روشنی کی باریک لیکن تیز لکیر صرف انھیں پہلوؤں کو منور کرتی ہے جو واقعے اور واقعے سے متاثر ہونے والی اشیا کی ٹھوس شئیت کو ثابت کرے، اور گفتگو کا لہجہ خود کلامی سے لے کر ڈائری تک کے اندر پر محیط ہو، انور سجاد کا خاصہ ہے۔[17]

یہ ناول ایک رزمیہ ہیرو کی داستان ہے اور انور سجاد نے وقت کے مختلف دائروں، اسیر کرداروں کو ایسے استعاروں میں منتقل کیا ہے کہ جو ایک دوسرے میں جذب ہو کر ایک دوسرے کا تکملہ بن جاتے ہیں۔مصنف قاری کو سماج کے داخلی و خارجی دشمنوں سے ہوشیار کرتے ہیں اور اسے خبردار کرتے ہیں کہ بیوروکریٹ طبقہ انقلاب اور سماجی تبدیلی کی پرکشش اصطلاحات کی آڑ میں اپنے مفادات کا تحفظ کر رہے ہیں۔ان تمام باتوں کی وجہ سے پورا معاشرہ عدم مساوات اور بے راہروی کا شکار ہو چکا ہے۔

یہ ایک غیر انسانی اور غیر جمہوری معاشرہ ہے جس میں ''میں'' مسلسل تناؤ کا شکار ہے کہ اس کا مسئلہ کسی ایک فرد کا نہیں مسئلہ نہیں بلکہ ایک پوری قوم کا مسئلہ ہے۔یہاں کوئی بھی باشعور شخص اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے سے گریز کرتا ہے کیونکہ تیسری دنیا مسلسل تجربات کے عمل سے گزر رہی ہے اور اس کی سب سے بڑی مثال پاکستان ہے۔یہاں جمہوریت اور فوجی آمریت کے بار بار تجربات کیے جا چکے ہیں جواب تک بے سُود ثابت ہوئے ہیں۔ان حالات کی وجہ سے حساس شہری زندگی بے مقصد ہو کر رہ گئی ہے۔دانشور طبقہ بھی اقتدار کی غلام گردشوں کے حصار میں آ چکا ہے۔الفاظ کی حُرمت ختم ہو چکی ہے:

> میں لفظوں کی قوت دریافت کرنا چاہتا ہوں میں کہنا چاہتا ہوں پھول۔۔۔پتے۔۔شبنم۔۔۔میں کہنا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔میں بارش میں بھیگ جانا چاہتا ہوں، میں لفظوں کو بادلوں کی گرج میں ڈھالنا چاہتا ہوں۔[18]

جدید عہد سماجی اور سیاسی سطح پر تنزلی کا شکار ہو چکا ہے۔ایسے میں لفظوں کی حُرمت کا خاتمہ انسانیت کے جذبات سے

عاری ہونے کے مترادف ہے۔اس میں نہ صرف سماجی رویوں کا عمل دخل ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ برسراقتدار طبقے کی نا عاقبت اندیشی بھی بھرپور انداز میں اثر انداز ہو رہی ہے۔انور سجاد اپنے ایک مضمون ''پنڈارے اور عہد نامہ'' میں الفاظ کی حرمت اور معروضی حقائق کو کچھ اس انداز میں بیان کرتے ہیں:

> میرا پہلا عہد لفظ سے ہے، لفظ کی حرمت سے ہے، میں جو تضادات سے بٹے معاشرے میں اپنے بٹے ہوئے سانسوں کو یکجا کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہوں، وہ لفظ جو میرا نجات دہندہ ہے، اس معاشرے میں میری نجات اسی طور سمجھتا ہے کہ میں اسے اپنی ذات سے برآمد کر کے معروضی حقیقتوں کے حوالے سے اس سے استحصال، ظلم اور جبر پر وار کروں کہ بنیادی طور پر مجھے اپنے آپ کو معاشرے کی اسی سانپوں اور سیڑھیوں والی لڈو سے Resurrect کروانا ہے۔[19]

انور سجاد اس ناول کے ذریعے بتاتے ہیں کہ آمریت ہو یا جمہوریت دونوں چہروں پر نقاب چڑھا کر فرد کی آزادی اور حریت کو مختلف ہتھکنڈوں سے تہہ و بالا کر رہی ہے۔ایک عام آدمی روزی روٹی کے چکر میں بری طرح جکڑا ہوا ہے، وہ اپنی معمولی ضروریات کی تکمیل کے لیے تمام عمر کی غلامی کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے جبکہ آزادی انسان کا فطری حق ہے جسے سلب کرنا کسی بھی حالت میں جائز نہیں ہے۔یہی وجہ ہے کہ انور سجاد اس گھٹن زدہ اور تاریک صورتحال میں بھی خوفزدہ نہیں بلکہ پر امید نظر آتے ہیں۔

انور سجاد کا تیسرا ناول ''جنم رُوپ'' ۱۹۸۴ء میں منظر عام پر آیا۔یہ ناول ایک عورت کی جدوجہد کی داستان ہے مگر یہ محض ایک خاتون کی کہانی نہیں بلکہ علامتی انداز سے پورے معاشرے کی داستان ہے۔''جنم رُوپ'' میں مردوں کے کردار ہمارے معاشرے میں جاگیردارانہ نظام کو پروان چڑھانے والے ایسے نمائندہ کردار ہیں جو عورت کو کچھ نہیں سمجھتے، بے شمار دکھ اس کی جھولی میں ڈال دیے جاتے ہیں اور اس کا ہر طرح سے استحصال کیا جاتا ہے۔ایک جانب جاگیرداری نظام ہے اور دوسری طرف توہم پرستی کا نظام ہے تیسری جانب روایت پسندی ہے تو چوتھی طرف جدت کے ساتھ زندگی صنعتی ترقی میں ڈھلتی جا رہی ہے۔یہ تمام چیزیں آپس میں مل کر چلتی ہیں اور اس دوران جو صورتحال سامنے آتی ہے، وہی اس معاشرے کے افراد کا المیہ ہے۔

''جنم رُوپ'' تجربات کے اعتبار سے ''خوشیوں کا باغ'' سے زیادہ بہتر ہے۔اس ناول میں کہانی کا شیرازہ زیادہ گاڑھا نہیں ہے۔موضوع کے لحاظ سے یہ ناول ''خوشیوں کا باغ'' سے قریب ہے۔اس ناول میں بھی احتجاج کی قوت نظر آتی ہے، ''جنم رُوپ'' شاعرانہ نثر میں لکھا گیا ہے۔دراصل یہ ناول ''خوشیوں کا باغ'' کی ہیئتی، اسلوبیاتی اور موضوعاتی توسیع ہے۔اس میں زبان علامتوں اور استعارات سے مرصّع ہے اور روانی کا احساس بھی ملتا ہے۔ڈاکٹر انیس ناگی کا کہنا ہے:

> جنم روپ مختلف اقتباسات میں لکھا گیا ناول ہے جو کہانی اور ربط کی نفی کرتا ہے اس ناول میں بھی شاعرانہ نثر کو ناول کے مروجہ لسانی اسلوب پر ترجیح دی گئی ہے۔انور سجاد نے اردو ناول کو نئے ڈگر پر ڈالنے کی کوشش کی

ہے۔کرداروں اور واقعات کے بجائے مصنف نے بیانات کے ذریعے ان ناولوں میں حرکت پیدا کی ہے۔[۲۰]

انور سجاد حقیقت پسندی کے ساتھ ساتھ ناول کے اسلوب پر بھی بے پناہ توجہ دیتے ہیں۔ان کا ناول ''جنم رُوپ'' بھی ''خوشیوں کا باغ'' کی طرح موضوعاتی اعتبار سے گنجلک ہے۔انور سجاد نے اس ناول میں بیانیہ کے ساتھ استعاراتی زبان اور بہترین اسلوبیاتی قوت اور کہیں کہیں فینٹسی کی تکنیک بھی استعمال کی ہے۔ناول کا مرکزی کردار ایک خاتون ہے جو اپنے خوابوں اور آدرشوں کے مطابق اپنی دنیا آپ تخلیق کرنے کی آرزومند ہے مگر مردانہ برتری کا شکار معاشرے میں ایسا ممکن نہیں ہو پاتا۔مختصراً انور سجاد علامتی ناول نگاروں میں ایک خاص امتزاج کے علمبردار ہیں۔ان کے یہاں علامت کے ساتھ ساتھ تجرید کا بھی زبردست عمل دخل ہے۔وہ اشیا کو وجود سے الگ کر کے دیکھتے ہیں اور وجود کی نفی کی راہ پر چلتے ہیں۔اس روشنی کو انور سجاد گہری علامتوں کے ذریعے واضح کرتے ہیں۔جب ان کے ناولوں میں یہ عمل بے ساختہ وجود میں آتا ہے تو ایک نئے ذائقے اور ایک نئی جہت کی نشاندہی کرتا ہے جو کہ انھیں ایک تجربات پسند تخلیق کار کے طور پر آفاقی حیثیت سے ہمکنار کرتا ہے۔انور سجاد کی تخلیقی شخصیت کا ایک اور بے حد اہم پہلو اُردو اسٹیج اور ٹیلی ویژن ڈرامہ نگاری ہے۔

الحمرا آرٹس کونسل لاہور میں فنون لطیفہ اور فن ادائیہ کے فروغ میں ڈاکٹر انور سجاد کا کردار بہت اہم رہا ہے۔ڈاکٹر انور سجاد الحمرا آرٹس کونسل کے چیئر مین رہے۔اس دوران انھوں نے موجود عمارت کے ماڈل کو منظور کروایا اور اردو اسٹیج ڈرامے کے معیار کو بہتر کرنے کے بہت سی کوششیں کیں۔اس کے ساتھ انھوں نے ترجمہ اور طبع زاد جدید اردو ڈرامے لکھ کر الحمرا میں پیش کیے۔اس مقالے میں ان کے پیش کیے جانے والے تین غیر مطبوعہ اُردو اسٹیج ڈراموں ''،ایک تھی ملکہ''،''خطرہ جان'' اور'میری جان'' کا فنی ،فکری ،موضوعاتی اور تکنیکی تجزیہ پیش کیا گیا ہے کہ کس طرح انھوں نے جدید اردو اسٹیج ڈرامے کے فروغ میں فنی اور فکری حوالے سے وسعتیں پیدا کی ہیں۔

انور سجاد زمانہ الطالبعلمی سے ہی لاہور کے مختلف پروگراموں میں شرکت کرتے تھے۔گورنمنٹ کالج اور ایف سی کالج میں اسٹیج ڈراموں میں بطور اداکار شرکت کرتے رہے اور اسی زمانے میں انھوں نے ڈرامہ لکھنا بھی شروع کیا۔وہ اپنے ایک انٹرویو میں بتاتے ہیں:

> I started when I was still at Government College. Actually I learnt the A-B-Cs of playwriting at Government College and its grammar at FC College. In the beginning I used to translate from English to Urdu because there was no institution where I could learn professionall.(۲۱)

۱۹۵۹ء سے ۱۹۷۱ء تک حلقہ اربابِ ذوق کے سیکرٹری رہے۔۱۹۶۴ء میں پاکستان ٹیلی ویژن کا آغاز ہو تو آپ پاکستان ٹیلی ویژن سے وابستہ ہو گئے اور آپ کا پہلا مزاحیہ کھیل ''رس ملائی'' نومبر ۱۹۶۴ء پر براہ راست پیش کیا گیا۔اس کھیل تھیٹر کے اداکار سکندر شاہین ،مسعود اختر اور کنول نصیر صاحبہ وغیرہ شامل تھے۔۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۳ء پاکستان آرٹسٹ

ایکویٹی کے چیئرمین رہے۔ ۸۔اگست ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۵ء کے تک الحمرا آرٹس کونسل لاہور کے پہلے چیئرمین رہے۔ممبر بورڈ آف گورنرس پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس لاہور (۲۰۰۴ء۔۲۰۰۱ء، ۱۹۹۱۔۱۹۸۶ء، ۱۹۷۶ء۔۱۹۷۳ء) رہے اورا یگزیکٹو کمیٹی کے ۲۰۰۴ء سے تاحال ممبر ہیں۔سینٹرل فلم سینسر بورڈ میں اگست ۱۹۷۳ء سے اپریل ۱۹۷۵ء اور پھر ۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۱ء تک رہے۔ ۱۹۹۵ء میں Tele Sine International (audio-video cassettes) پروڈکشن کمپنی ایسٹ کے چیئرمین رہے۔۲۰۰۴ء سے تاحال جیو ٹی وی نٹ ورک کے ڈیپارٹمنٹ Script and creative writing کے ہیڈ ہیں۔ڈیپارٹمنٹ آف ملٹی میڈیا پاکستان نیشنل کالج آف آرٹس میں ۲۰۰۴ء سے ۲۰۰۲ء تک وزٹینگ پروفیسر کے طور پر وبستہ رہے۔۲۰۰۲ء سے ۲۰۰۳ء تک ILM university lahore میں وزٹینگ پروفیسر کے طور پر وابستہ رہے۔ ڈیپارٹمنٹ آف میس کمیونیکیشن پنجاب یونیورسٹی لاہور میں ۲۰۰۳ء سے ۲۰۰۴ء تک وزٹینگ پروفیسر کے طور خدمات انجام دیں۔نیشنل اکیڈمی آف پرفارمنگ آرٹس کراچی کے ۲۰۰۵ء سے تاحال فیکلٹی ممبر ہیں اوراکیڈمی آف لیٹرز کے تاحیات ممبر ہیں۔ حکومت پاکستان کی طرف صدراتی تمغۂ برائے حسن کارکردگی سے نوارے گئے۔[۲۲] ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں: ''رگ سنگ''، ''استعارے''، ''پہلی کہانیاں''، ''چوراہا''، ''زرد کونپل''، ''خوشیوں کا باغ''، ''نگار خانہ''، ''صبا اور سمندر''، ''جنم روپ''، ''نیلی نوٹ بک''، ''رسی کی زنجیر''، اور ''مجموعہ ڈاکٹر انور سجاد'' وغیرہ۔

ڈاکٹر انور سجاد کا ایک غیر مطبوعہ کھیل ''خطرۂ جان'' کا ٹائپ شدہ مسودہ الحمرا میں موجود ہے جو ۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ٹائپسٹ کا نام سعید لکھا ہے اور تاریخ ۱۹۸۱ء درج ہے۔اس مسودے کے آخر میں چند صفحات میں، کھیل میں مختلف جگہوں پر مکالمات کے اضافے اور تبدیلیاں درج ہیں۔

ایک ایکٹ پر مشتمل یہ ایک طنزیہ کھیل ہے، جسے دو مناظر میں تقسیم کیا گیا ہے۔اس کھیل میں ڈرامہ نگار نے ''ڈاکٹری کے پیشے'' کو موضوع بنایا ہے۔اس شعبہ کے اندر پائی جانی والی خامیوں اور کوتاہیوں کو دکھایا ہے۔وہ خواہ اس پیشے کے حوالے سے ہیں یا اس کے سماجی معاملات ہیں۔اس کھیل کا عنوان ''خطرہ جان'' اسی مناسبت سے رکھا گیا ہے کہ ایسے نااہل ڈاکٹر، مریضوں کی جان کے لیے خطرہ ہوتے ہیں۔ان کی ادویات صحت کے بجائے موت کا سبب بنتی ہیں۔اس کھیل میں ایک تو خارجی تصادم ہے جو خالد اور ڈاکٹر کے ساتھ چلتا ہے۔دوسرا ڈاکٹر اور مریض کے درمیان تصادم ہے لیکن اس کھیل میں سب سے بڑا داخلی تصادم ہے جو ڈاکٹر کا اُس کی اپنی ذات کے ساتھ ہے اور جو اجنبی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔اپنی غلط حرکتوں اور برائیوں کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر داخلی کرب اور خارجی تصادم میں مبتلا رہتا ہے۔اس کھیل کے دوسرے دو کردار خالد اور بانو عام روایتی قسم کے کردار ہیں۔بانو کا کردار خالد سے زیادہ جاندار اور مظبوط ہے۔وہ تہذیب وثقافت شرم وحیا اور نسوانی وقار سے بھرپور کردار ہے۔اسے ایک طرف اپنے منگیتر سے محبت ہے تو دوسری طرف باپ کی عزت بھی بہت پیاری ہے۔وہ بھاگ کر شادی کی مخالف ہے اور والد کی رضامندی کی منتظر ہے۔

اس کھیل کے کرداروں کی زبان عام بول چال کی طنز ومزاح سے بھر پور ہے۔اس میں خودکلامی کی تکنیک کو بھی استعمال کیا گیا ہے۔ڈرامہ نگار کو مکالمہ نگاری پر بڑا عبور حاصل ہے۔سیدھی سادی عام اور سادہ باتوں کو بھی اتنا دلچسپ بنا دیتے ہیں کہ ان کے فن کی داد دینا پڑتی ہے۔ذرا ان کرداروں کے کچھ مکالمے ملاحظہ کیجیے:

بانو: تو تم ہی سمجھ جاؤ۔ابا تم سے ملنے تو دیتے نہیں۔اگر تمہارے ساتھ کہیں چلی گئی تو وہ مجھے زندہ چھوڑیں گے؟

خالد: واپس آؤ گی تو،زندہ چھوڑنے نہ چھوڑنے کا سوال پیدا ہوگا۔

بانو: (پریشانی،خوفزدہ) یعنی۔یعنی۔میں واپس نہیں آؤں گی؟

خالد: واپس آئیں گے تمہارے دشمن بانو۔یہ موقع خدا کا عطا کردہ ہے۔میرے ساتھ چلو ہم یہاں سے نکلتے ہی شادی کرلیں گے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہوجائیں گے۔

بانو: اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خوش رہیں گے؟

خالد: (یقین دلاتے ہوئے) ہاں ہاں۔

بانو: یعنی تم مجھے اپنے ساتھ بھاگ جانے کو کہہ رہے ہو۔

خالد: (نہ چاہتے ہوئے بھی) ہاں۔

بانو: تمہیں شرم آنی چاہیے خالد۔ایسی بری باتیں کرتے ہو۔[۲۳]

اس کھیل میں شامل تمام کرداروں کا تعلق مڈل کلاس سے ہے اور ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے ان کی اخلاقیات، تہذیب ومعاشرت اور مزاج کا پتا چلتا ہے۔مڈل کلاس کے ہاں اخلاقیاتی حوالے سے ذات کا کرب،ذات کی پابندیاں اور اخلاقی سرحدوں کی دیواریں حائل ہوتی ہیں وہ یہاں بھی محسوس کی جاسکتی ہیں۔جنھیں عبور کرنے کے لیے اپنے آپ سے جنگ کرنی پڑتی ہے۔ڈاکٹر،خالد،بانو اور اجنبی کے ہاں یہی جنگ کا میدان نظر آتا ہے۔

اس کھیل میں ایک ڈاکٹر کے کلینک کا سیٹ استعمال کیا گیا ہے۔ایک بڑا سا کمرہ جس کا پچھلا دایاں نصف حصہ، دیوار کھڑی کرکے ڈسپنسری بنا دیا گیا ہے۔ڈسپنسری میں پڑی مختلف ادویات نظر آتی ہیں۔یہاں ایک چھوٹی سی کھڑکی ہے جس میں مریض دوائی وصول کرتے ہیں۔کلینک میں دو دروازے ہیں۔ایک اندرونی دروازہ جہاں چق پڑی رہتی ہے اور دوسرا بیرونی،سامنے کی دیوار میں بھی ایک کھڑکی ہے۔سیٹ کے اگلے حصے میں بائیں طرف کو اندرونی دروازہ سے آگے ذرا نیچے کو ہٹ کر آڑے انداز میں ڈاکٹر کی میز،جس پر گلا دیکھنے کے اوزار،ایک بوتل میں تھرمامیٹر،بلڈ پریشر دیکھنے کا آلہ اور کان،ناک،گلہ دیکھنے کا آئینہ اور ٹرے وغیرہ پڑے ہیں۔میز کے پیچھے بائیں دیوار کی طرف،ڈاکٹر کی کرسی کچھ اس انداز سے رکھی ہے کہ ڈاکٹر کی پشت اندرونی دروازے کی طرف رہتی ہے۔میز کے بالکل سامنے چھوٹا سا بنچ،ایک سٹول،ڈاکٹر کی

دائیں طرف ہے۔ دائیں دیوار کے ساتھ بیرونی دروازے سے پرے ایک بنچ بائیں کونے میں، سٹول پر حمام مارکہ کولر پڑا ہے۔ جس کے نلکے کے نیچے بالٹی رکھی ہے۔ کولر کے ساتھ ہی میلا سا تولیہ، صابن اور ایک گلاس۔ دیوار پر انسانی ڈھانچہ کی تصویر، آنکھیں ٹیسٹ کرنے والے چارٹ اور کیلنڈر وغیرہ لگے ہیں۔ ڈسپنسری کے دائیں طرف کونے میں ایک تختی آویزاں ہے جس کا رخ ناظرین کی طرف ہے اس پر لکھا ہے:

ڈاکٹر الحاج رحمت دین، بی۔ بی۔ ایل (جے) جی۔ جی (انگلینڈ) آر۔ ایم۔ پی۔ (ڈبلیو۔ پی) زنانہ و مردانہ امراض کے ماہر معالج و چلڈرن اسپیشلسٹ نیز یہاں پر ختنے بھی کیے جاتے ہیں۔[۲۴]

اس مختصر سے کھیل میں ڈرامہ نگار نے تھیٹر ڈرامے کی جدید تکنیک کو استعمال کرتے ہوئے بہت عمدہ سیٹ، روشنی اور اصوات کا استعمال کرتے ہوئے اردو سٹیج ڈرامے کی روایت میں طنزیہ کھیل کا بہت عمدہ اضافہ کیا ہے جو ڈرامائیت سے بھرپور ہے۔

ڈاکٹر انور سجاد کا تحریر کردہ تیسرا کھیل ''میری جان'' جو ۷ دسمبر ۱۹۸۶ء میں الحمرا آرٹس کونسل میں پیش کیا گیا۔ یہ کھیل مارک کامولیٹی (Marc Camoletti) کے کھیل ''Boeing-Boeing'' سے ماخوذ ہے۔ کامولیٹی جدید فرانسیسی ڈرامہ نگار ہے جو ۱۶ جونومبر ۱۹۴۲ء کو پیدا ہوا اور ۱۸ جولائی ۲۰۰۳ء میں وفات پائی۔ اس کا مذکورہ کھیل پہلی بار اپالو تھیٹر لندن (The Apollo Theatre London) میں ۱۹۶۲ء میں پیش کیا گیا۔[۲۵]

اس کھیل کا مسودہ قلمی ہے ڈاکٹر انور سجاد کے ہاتھ کا لکھا ہوا، باریک قلم سے، A4 سائز کے ۵۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے آخری صفحہ پر ڈاکٹر انور سجاد کے دستخط کے ساتھ ۷ دسمبر ۱۹۷۶ء کی تاریخ رقم ہے۔ اس کھیل کے مصنف اور ہدایات ڈاکٹر انور سجاد تھے لیکن پیش کار عائشہ تسلیم تھیں۔

اس کھیل میں ڈرامہ نگار مزاحیہ انداز میں کثرت ازواج جیسے سنجیدہ موضوع کو پیش کیا ہے۔ تین ایکٹ پر مشتمل یہ کھیل سچوایشنل کامیڈی (situational comedy) ہے۔ ڈرامہ نگار نے جگہ جگہ ایسی صورت حال پیدا کی ہے کہ کردار خارجی تصادم میں مبتلا ہوتے رہتے ہیں۔ جیسے اس کھیل میں جمیل نے تین لڑکیوں سے منگنی کر رکھی ہے۔ لیکن کسی بھی لڑکی کو پتا نہیں چلتا کہ یہ کسی اور لڑکی سے بھی منگنی کیے ہوئے ہے۔ تینوں لڑکیاں ملازمت کرتی ہیں۔ ان کے آنے جانے کا دن اور وقت طے ہے کھیل کے آخری ایکٹ میں لڑکیوں کی آمد کا ٹائم ٹیبل درہم برہم ہو جاتا ہے۔ جمیل اور اس کا دوست بشیر بڑی چابکدستی سے صورت حال کو سنبھالتے ہیں۔ اس طرح کھیل میں تجسس کی فضا برقرار رہتی ہے۔ ناظرین بڑی شدت سے اس لمحے کے منتظر رہتے ہیں کہ کب جمیل کا پول کھلتا ہے۔ کھیل کا اختتام طربیہ ہے۔

اس کھیل کا پلاٹ سادہ مگر مضبوط ہے۔ کردار نگاری بہت جاندار ہے۔ تمام کرداروں کے مکالمات بہت مختصر مگر دلچسپ اور جامع ہیں۔ سارا کھیل ایک فطری بہاؤ میں چلتا ہوا ناظرین کو اپنی گرفت میں لیے ہر لمحے اس تجسس میں مبتلا رکھتا ہے کہ جمیل کے ساتھ اب کیا ہوگا۔ کھیل کے مرکزی کردار جمیل اور اس کے دوست بشیر جب پہلی بار اکیلے بیٹھے ہوتے ہیں تو

ان کے کچھ مکالمے ملاحظہ کیجیے:

بشیر: لیکن اتنی ساری بیویوں کو manage کرنا__

جمیل: فی الحال بیویاں نہیں میری__ میری جان، منگیتریں ہیں۔اور منگیتریں اس وقت تو بیویوں سے بہتر ساتھی اور دوست ثابت ہو رہی ہیں__

بشیر: کمال کرتے ہو یار__ ایک بیوی کا خرچ برداشت نہیں کر سکتا انسان اور تم__ اور پھر جتنی بیویاں ہوں گی بچے بھی تو__ نرا جنجال ہے بھئی__ پاگل ہو جاؤ گے__

جمیل: اجازت تو ہے چار شادیوں کی۔۔۔

بشیر: اوہو__ اجازت تو ہے__ لیکن شرائط جانتے ہو__ یہ شرائط پوری کر سکتے ہو__ ہم جیسا انسان تو ایک بیوی کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا__ ہنہ اجازت تو ہے لیکن تمھیں تو شرم کرنی چاہیے۔

جمیل: اس لئے تو ابھی تک منگیتروں پر اکتفا کر رہا ہوں۔

بشیر: کتنی ہیں؟

جمیل: تین__

بشیر: (چیختا ہے) تین__ اکٹھی__![۲۶]

ان کرداروں کے انتہائی مختصر مکالمات بہت چست ہیں۔اس مختصر سی گفتگو میں ڈرامہ نگار نے دونوں کرداروں کے اندر کے انسان کو سامنے لا کر کھڑا کر دیا ہے۔کرداروں کی ذہنیت، مذہب، سیاست، اچھائی اور برائی سب واضح ہو جاتا ہے۔اس کھیل کے کردار بہت فعال ہیں۔ان کے رگ و پے میں ایک برقی لہر دوڑ رہی ہے۔یہ کردار ہلکا ہلکا مذہبی، سیاسی سماجی اور معاشرتی موضوعات کو چھو کر گزر جاتے ہیں۔بس اشارہ کرتے ہیں۔کہیں کوئی کردار کھل کر بات نہیں کرتا ہے۔کرداروں کے مکالمات صاف ستھرے اور معیاری ہیں۔ڈرامہ نگار نے فرانسیسی کھیل کو اُردو زبان میں اس طرح ڈھالا ہے۔غیر محسوس انداز میں کراچی شہر کھیل میں سما گیا ہے۔ڈاکٹر انور سجاد ڈرامہ نگاری کے علاوہ ہدایت کار اور اداکار بھی ہیں۔انھوں نے اس کھیل کو فنی اور فکری حوالے سے بہت مضبوط بنا کر پیش کیا ہے۔

اس کھیل کے صفحہ اوّل پر ڈرامہ نگار نے کھیل کے سیٹ کی ڈرائینگ بھی کی ہے۔اس حوالے سے الحمرا لاہور آرٹس کونسل لاہور سے دستیاب ہونے والے سکرپٹس میں یہ پہلا سکرپٹ ہے جس پر ڈرامہ نگار نے سیٹ کی ڈرائینگ کی ہے۔اس میں جمیل کے گھر کا سیٹ ہے۔جس میں ڈرائینگ روم اوپر نیچے ہیں۔سیٹ پر پچھلی طرف سے ایک سیڑھی اونچے پلیٹ فارم پر ڈرائینگ روم کی طرف جاتی ہے۔ڈائینگ روم کے بائیں ہاتھ کی سامنے کی دیوار اور بائیں دیوار کے ساتھ لگی شیشے کی الماری، جس میں برتن سجے ہیں، سامنے کی دیوار کے ساتھ ریفریجریٹر پڑا ہوا ہے۔کھانے کی گول میز وسط سے ذرا دائیں

جانب جس کے گرد چار کرسیاں لگی ہیں۔ڈرائینگ روم میں بائیں جانب صوفہ، سامنے وسطی میں میز، دائیں دیوار کے ساتھ رائیٹنگ ٹیبل، کرسی، میز پر ٹیلی فون، بین الاقوامی پروازوں کا ٹائم ٹیبل اور گلوب پڑا ہے۔میز میں دراز بھی ہیں۔آرائش سادہ لیکن بہت دلآویز، کمرے کا ماحول بہت شگفتہ اور اُجلا اجلا ہے۔ بائیں دیوار میں چار دروازے ہیں۔جن پر نمبر ۴۔۵۔۶ اور ۷ نمبر لکھے ہوئے ہیں۔۴ نمبر دروازہ باہر کھلتا ہے۔دروازہ پانچ، دروازہ چھ اور ساتھ بیڈروم کے دروازوں کے درمیان میں کامن باتھ روم ہے۔پچھلی دیوار میں دروازہ نمبر ۳ باورچی خانے میں کھلتا ہے۔دائیں دیوار میں دروازہ نمبر ۲ ہے اور دروازہ نمبر ۱ بیڈروم میں کھلتا ہے۔

انور سجاد نے سٹیج اور ناظرین کی ضروریات کے تحت ڈرامے تخلیق نہیں کیے۔اگر ایسا ہوتا تو ان کے ڈراموں میں جگتوں، فقرے بازوں اور جذبات خیز الہامی فقروں کی بھرمار ہوتی اور وہ ناضرین سے بھرپور داد وصول کر رہے ہوتے۔ لیکن انھوں نے دوسرا راستہ اختیار کیا یہی وجہ ہے کہ معروضی پابندیوں کے باوجود ان کے ڈرامے فکر اور سوچ کا عنصر لیے ہوئے ہیں۔تاہم وہ ان میں اس حد تک کامیاب ضرور ہوئے ہیں کہ ان کا علامتی پیغام ناظرین تک پہنچا ہے۔

انور سجاد نے اُردو ادب کی مختلف اصناف افسانہ، ناول، اسٹیج اور ٹی وی ڈراموں میں اپنے نظریاتی شعور اور بیداری پر مشتمل خیالات وتصورات کا اظہار بحیثیت ادیب نہایت عمدگی سے کیا ہے۔موضوعاتی سطح پر ان کی تخلیقات خواہ وہ افسانے ہوں، ناول یا ڈرامے، ان میں انسانیت دوستی اور سماج سدھار کا پیغام ملتا ہے۔خصوصاً انھوں نے اپنے اسٹیج ڈراموں میں اپنے عہد کے سماجی اخلاقی زوال اور درپیش مسائل کا بیان اور ان کے ممکنہ حل کو موضوع بنایا ہے۔ان کے ڈراموں کے کردار کسی مخصوص اخلاقی عیب کا شکار نظر آتے ہیں تو ڈرامہ نگار کا ان انسانوں سے نفرت کے بجائے ان کے اعمال سے بیزاری اور صورتحال کو بہتر بنانے کی خواہش کا واضح اظہار ہوتا ہے۔اسلوبیاتی حوالے سے فکشن اور اسٹیج ڈراموں میں مختلف تجربات کیے گئے ہیں۔ان کے افسانوں اور ناولوں میں علامت اور استعارے کے پردے میں نہ صرف مقامی حکومتی آمروں بلکہ بین الاقوامی انسان دشمن سامراجی طاقتوں کے ظلم اور جبر مسلسل پر نہایت توانا احتجاج کا اظہار ملتا ہے۔جو کہ ان کے ترقی پسندانہ نظریات رکھنے والے نئے علامتی طرز کے تخلیق کار ہونے کی دلیل ہیں۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ انیس ناگی، ڈاکٹر، پاکستانی اُردو ادب کی تاریخ، (لاہور: جمالیات، ۲۰۰۴ء)، ص: ۲۰۔

۲۔ انور سجاد، ''پرومتھیس''، مشمولہ: مجموعہ از ڈاکٹر انور سجاد، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء)، ص: ۱۵۱۔

۳۔ بحوالہ گوپی چند نارنگ، اُردو افسانہ روایت و مسائل، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء)، ص: ۵۱۵۔

۴۔ قاضی عابد،ڈاکٹر،اُردو افسانہ اور اساطیر،(لاہور:مجلس ترقی ادب،اشاعت اوّل،جون ۲۰۰۹ء)،ص:۲۰۵۔

۵۔ سراج منیر،کہانی کے سو رنگ،(لاہور:جنگ پبلشرز،۱۹۹۱ء)،ص:۹۷۔

۶۔ انورسجاد،''واپسی۔دیوجانس۔روانگی''،مشمولہ:مجموعہ،ص:۲۳۶-۲۳۵۔

۷۔ شہزادمنظر، جدید اُردو افسانہ،(کراچی:منظرپبلی کیشنز،باراوّل،مئی۱۹۸۲ء)،ص:۱۰۰۔

۸۔ انورسجاد، رگ سنگ،(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۲ء)،ص:۸۷۔

۹۔ انورسجاد،خوشیوں کا باغ،(لاہور:قوسین،۱۹۸۱ء)،ص:۲۰۔

۱۰۔ انورسجاد،تلاش وجود،(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۶ء)،ص:۱۳۔

۱۱۔ بحوالہ گوپی چندنارنگ،مرتبہ:ادب کا بدلتا منظر نامہ اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ،(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۰ء)،ص:۲۷۸۔

۱۲۔ انورسجاد،خوشیوں کا باغ،ص:۱۰۶۔

۱۳۔ انیس ناگی، تصورات،(لاہور:جمالیات،سن اشاعت ندارد)ص:۱۶۲۔

۱۴۔ انورسجاد، خوشیوں کا باغ،ص:۱۲۳۔

۱۵۔ انیس ناگی،پاکستانی اُردو ادب کی تاریخ،(لاہور:جمالیات،۲۰۰۴ء)،ص:۲۴۵۔

۱۶۔ انورسدید،ڈاکٹر،نئے جائزے،(لاہور:مغربی پاکستان اُردواکیڈمی،۱۹۸۹ء)،ص:۱۰۸۔

۱۷۔ بحوالہ:اردو افسانہ روایت اور مسائل،گوپی چندنارنگ،(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۲ء)،ص:۵۸۷۔

۱۸۔ انورسجاد،خوشیوں کا باغ،ص،۴۷۔

۱۹۔ انورسجاد،''پنڈارے اورعہدنامہ''،مشمولہ:ماہنامہ فنون،جلد،۱۳،شمارہ،۱۳،(اگست۱۹۷۱ء)،ص:۹۳-۹۲۔

۲۰۔ انیس ناگی، پاکستانی اُردو ادب کی تاریخ،ص،۲۴۵۔

۲۱ Polymath Dr Enver Sajjad was a student at Forman Christian College in the 1950s. The following are translated (English translation of excerpts from the original Urdu article "Doctor Enver Sajjad (Sabiq Editor Folio) Say Aik Mulaqat") excerpts from an interview he gave to FCC students (Interview panel: Asif Alipota, Nighat Khurshid.) for the Golden Jubilee issue of Folio magazine

in 1985.Enver sajjad was secretary college Union society and editor Folio, secretary cricket club (1953-1954)

۲۲۔ ڈاکٹر انور سجاد کو مندرجہ ذیل قومی اور بین الاقوامی ایوارڈز سے نوازا گیا:

National Award:

President of Pakistan Award

Pride of performance in literature (1989).

International award :

ECO biennale Award Of excellence for outstanding contribution and research in the field of history, culture, literature and fine arts… 8th ECO summit, Dushanbe, Tajikistan, September 14, 2004

۲۳۔ انور سجاد، قلمی مسودہ، خطرئہ جان، (لاہور: مخزونہ، الحمرا لاہور آرٹس کونسل لائبریری، ۱۹۸۱ء) ص: ۱۰۔۱۱

۲۴۔ انور سجاد، خطرئہ جان، ص: ۲

۲۵۔ http://en.wikipedia.org/wiki/Marc_Camoletti_(playwright)

۲۶۔ انور سجاد، میری جان، قلمی نسخہ، (لاہور: مخزونہ، الحمرا لاہور آرٹس کونسل لائبریری، ۷ دسمبر ۱۹۸۶ء) ص: ۱۰۔۱۱